رالف رسل

شادم از زندگئ خویش

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ۱۹۳٤ میں میں کمیونسٹ ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ میرے کمیونسٹ عقیدوں کا تقاضہ تھا کہ میں اردو سیکھوں تاکہ میں اپنے سپاہیوں سے بات چیت کر سکوں اور ہندوستان کی آزادی کا ــ اور کمیونزم کا ــ پرچار کر سکوں۔ آج بھی میں اپنے آپ کو کمیونسٹ سمجھتا ہوں اور آج بھی اپنی کمیونسٹ سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ اور اگرچہ میرے کمیونسٹ عقیدے اور کمیونسٹ سرگرمیاں اس کتاب کا موضوع نہیں ہیں پھر بھی میں ان کا اجمالی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو کمیونسٹ کہے تو دوسروں کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

جب میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہوا تھا تو اکثر سنجیدہ لوگ کم و بیش یہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم کے معنی کیا ہیں۔ اس کے حامی ہوں یا مخالف، ان کا کمیونزم کا تصوّر تقریباً واضح بھی تھا اور بڑی حد تک صحیح بھی تھا۔ اب بہت عرصے سے یہ صورتِ حال نہیں رہی۔ ایک کمیونزم (مرحوم) سوویٹ یونین کا تھا، تو ایک چین کا کمیونزم، اور ایک اٹلی کا کمیونزم۔ ہندوستان میں سی۔ پی۔ آئی۔ کا کمیونزم ہے اور سی۔ پی۔ ایم۔ کا کمیونزم، اور نکسلائٹ کا کمیونزم بھی ہے۔ ان سارے گروہوں کے افراد اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے تھے یا کہتے ہیں۔ اور میں؟ میں ان میں سے کسی بھی دبستانِ خیال کا کمیونسٹ نہیں ہوں۔ جب لوگ پوچھتے کہ آپ کس قسم کے کمیونسٹ ہیں تو میں کہتا کہ میں نہ روسی کمیونسٹ ہوں نہ چینی، نہ اطالوی ۔ میں محض کمیونسٹ کمیونسٹ ہوں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ میرا بنیادی نقطۂ نظر انسان دوستی ہے، جس میں انسانی حقوق کا تحفّظ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ میری یہ کوشش رہتی ہے کہ میں دوسروں کے

ساتھ وہی برتاؤ کروں جس کی میں ان سے توقّع کرتا ہوں۔ (اصل میں توقع نہیں، امید کہنا چاہئے۔ میرا صول ہے کہ آپ ہر بات کی امید کرسکتے ہیں، کسی بات کی توقع نہیں کرسکتے)۔ ظاہر ہے کہ روزمرّہ کے معاملات میں اس تصوّر پر عمل کرنا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ روزمرہ کے معاملات میں زیادہ تر فرد سے فرد کے رابطے کا عمل رہتا ہے اور یہ رابطہ عام طور پر کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ مگر نہیں۔ یہ الفاظ لکھتے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر ان میں سچّا ئی ہے تو وہ کتنی محدود ہے۔ لکھتے وقت میرے ذہن میں وہ بیسیوں آدمی تھے جن سے روزمرّہ کی زندگی میں آپ کا واسطہ ــ سرسری، اتّفاقی، وقتی ــ پڑتا ہے۔ ان کی حد تک تو ٹھیک ہے، اور ایسی صورتوں میں .''فرد سے فرد کا رابطہ'' واقعی کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ لیکن ''فرد سے فرد کے رابطے'' کے دائرے میں اور بہت سے رابطے آتے ہیں۔ بیوی سے میاں کا رابطہ، معشوق (یا معشوقہ) سے عاشق (یا عاشقہ) کا رابطہ، ماں باپ سے بچّے کا رابطہ، اور بہت سے دوسرے رابطے سب ہی ''فرد سے فرد کے رابطے'' ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان رابطوں کو نبھانے میں بہت سے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں اور عام طور پر پیدا ہوتے بھی ہیں۔ بہرحال ان مسائل کو فی الحال جانے دیجیے اور ایک دوسرے مسئلے پر غور کیجیے۔ افراد کے علاوہ افراد کے گروہ بھی ہوتے ہیں۔ قومیں ہیں، سماجی طبقے ہیں، سیاسی پارٹیاں ہیں، وغیرہ وغیرہ، اور انسان دوست آدمی کے سامنے یہ مسئلہ آتا ہے کہ ان مختلف گروہوں کی طرف اس کا رویہ کس طرح کا ہونا چاہئے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سیاسی شعور بھی ہو۔ اس سیاسی شعور کی بنیاد بھی انسان دوستی پر ہی رکھنی بالکل ضروری ہے، لیکن انسان دوستی کا محض تصور ہی آدمی کے کام نہیں آئے گا۔ اور یہاں میں یہ بتا دوں کہ میرے نزدیک انسان دوستی کے اصول پر آپ باقاعدہ اور ہر وقت سوچ سمجھ کے چلنے کی کوشش کریں تو آپ لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچیں‌گے کہ کسی انسان کو کسی انسان کا، اور کسی سماجی طبقے کو کسی سماجی طبقے کے استحصال کا حق نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں لازمی طور پر انسان دوستی کی نفی کرتی ہیں۔ میں کمیونزم کو انسان دوستی کی ترقّی یافتہ شکل سمجھتا ہوں اور کمیونسٹ انسان کو انسان دوست انسان کی ترقّی یافتہ شکل۔ اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد غالباً یہ کہنے کی

ضرورت نہیں رہی کہ میں صرف اس کمیونزم کو صحیح معنوں میں کمیونزم سمجھتا ہوں جس میں انسانی حقوق کو نظر انداز کرنا کسی بھی طرح اور کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہوتا۔

اس تمہید کے بعد آپ سمجھیں گے کہ میرے لیے کمیونزم ایک ہمہ گیر نظریہ ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر ہوتا ہے اور میرے نزدیک کمیونسٹ انسان عام انسان سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جس کو غالب کے الفاظ میں میسّر ہوا انسان ہونا، ایسا انسان جو افراد اور قوموں اور سماجی طبقوں اور سیاسی پارٹیوں سے متعلق صحیح رویہ جانتا بھی ہے اور برتتا بھی ہے، ایسا انسان جس کی زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں جس میں اس کا کمیونسٹ عقیدہ کارفرما نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے شمار آدمی جو خود کو کمیونسٹ کہتے ہیں میری نظر میں کمیونسٹ ہیں نہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کا عمل میرے لیے ایک بہت ہی تلخ تجربہ تھا۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اس کا مختصر بیان مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب میں کمیونسٹ ہو گیا تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ عالمگیر کمیونسٹ تحریک ایک بین الاقوامی انقلابی فوج ہے جس کے سپاہی ایسے بہادر ہیں جو کمیونزم کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیّار رہتے ہیں، جن کے لیڈر کمیونزم کے ایسے عاشق ہیں جیسے منصور بن حلّاج اللہ کا حقیقی عاشق تھا، اور جن کا کمیونزم کا تصور وہی تھا جو میرا تھا (اور ہے)۔ لیکن ۱۹٤٦ میں پارٹی ممبر بننے کے تقریباً بارہ سال بعد کچھ ایسے واقعات ہوے جن کی بنا پر مجھے اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ میرا یہ تصور حقیقت سے کوسوں دور تھا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ اگرچہ ایسے کمیونسٹ ''سپاہی'' کافی تعداد میں موجود تھے جو میرے تصور کے مطابق تھے لیکن بیشتر تعداد ان کی تھی جو ایسے نہیں تھے اور رہے لیڈر تو ان میں سے اکثر ایسے تھے جو صحیح معنوں میں کمیونسٹ کہلانے کے بھی مستحق نہیں تھے۔ اب بہت عرصے سے میرا یہ پکّا خیال ہو گیا ہے کہ ہر ملک کی ہر سیاسی پارٹی کا ہر لیڈر جھوٹا، بے ایمان اور ظالم ہوتا ہے۔ (اور جو خود زیادہ ظلم نہیں کرتے وہ ظالموں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کا ظلم چھپاتے ہیں۔) اس کلّیے سے کمیونسٹ لیڈر کسی طرح بھی مستثنی نہیں۔

اس ۱۹٤٦ کے تجربے کا مجھے بہت بڑا صدمہ ہوا، لیکن ایسا نہیں کہ میں سنبھل نہ سکوں۔ اس کے بعد سے مجھے احساس رہتا ہے کہ حقیقت کی دریافت کتنی ہی تلخ اور

مایوس کن کیوں نہ ہو اس سے ہرگز منہ موڑنا نہیں چاہئے۔

اب مجھ پر ظاہر ہوگیا تھا کہ میرا ۱۹۳٤ کا کمیونزم کا تصور میری بہت بڑی سادہ لوحی پر مبنی تھا اور سچّی بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی زندگی میں کئی بار مجھے یہ محسوس کرنا پڑا ہے کہ میں بنیادی طور پر کافی سادہ لوح آدمی ہوں۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس سادہ لوحی کو دور کرنے میں (جہاں تک میں اسے دور کرسکا ہوں) کتنے تجربوں سے مجھے گزرنا پڑا ہے۔

لیکن اب اس بحث کو چھوڑیے اور اس کتاب کے اصل موضوع پہ آئیے۔ ۱۹٤۹ میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ میری عمر اب اکتیس سال تھی اور زندگی میں پہلی بار مجھے سوچنا پڑا کہ روزی کیسے کماؤں اور زندگی کیسے بسر کروں۔ میں خوش قسمت تھا۔ میں SOAS میں اردو کا لکچرر مقرر ہوگیا۔ یعنی مجھے ایسی ملازمت ملی جس سے میں خوش بھی رہ سکتا تھا اور جس میں (اپنے زعم میں) خدمتِ خلق بھی کرسکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ SOAS کے اربابِ حل و عقد اس معاملے میں بڑی حد تک میرے ہم خیال ہوں گے، یعنی جن خطوط پر میں کام کرنا چاہتا تھا یہ وہی ہوں گے جن پر وہ خود چاہتے ہوں گے کہ میں کام کروں۔ بہت جلد مجھے معلوم ہوا کہ یہ میری خوش فہمی تھی۔

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ جب دوسری عالمی جنگ ختم ہونے والی تھی تو انگریزی حکومت کو یہ احساس ہوا کہ اب دنیا کے سیاسی حالات میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں سوویٹ یونین، مشرقی یورپ، ایشیا اور افریقا کی زبانوں کی طرف بہت زیادہ توجہ دینی ہوگی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ SOAS کو ایک کافی بڑی رقم دی گئی تاکہ وہ اس کام کا ایک حصہ سنبھالے، اور اسی سلسلے میں میرا تقرر ہوگیا۔

یہ بالکل ظاہر تھا کہ اردو کے مطالعے کے امکانات میں اگر وسعت پیدا کرنی تھی تو پہلا قدم یہ تھا کہ عام انگریزوں میں اردو سے دلچسپی پیدا کرنی ہوگی۔ اور یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ اوّل تو خاصے پڑھے لکھے انگریزوں میں بھی بہت کم لوگ تھے جو اتنا بھی جانتے تھے کہ اردو ہے کیا۔ خود میرے ذاتی تجربے نے یہ بات بتائی۔ ۱۹٤٦ میں جب میں نے اردو باقاعدہ پڑھنی شروع کی، میرے اکثر دوست مجھ سے پوچھتے تھے کہ ''آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' میں کہتا تھا ''اردو۔'' اور وہ پوچھتے تھے کہ ''اردو کیا ہے؟'' اس صورت میں میں

سمجھا کہ انگریزوں کو یہ سمجھانا بہت ضروری ہے کہ اردو ایک اہم زبان ہے جسے کڑوڑوں انسان بولتے ہیں اور یہ کہ اس میں بہت اعلیٰ درجے کا ادب موجود ہے جو ہر طرح سے مطالعہ کرنے کے لائق ہے۔ اصل میں یہ دوسرا کام مقدّم تھا اور اسے کرنے کا سب سے موزوں طریقہ یہ تھا کہ اردو کی اچھی چیزوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ انگریز دیکھ سکیں کہ اردو میں کیا ہے۔ اگر اس کے نتیجے میں اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہو تو زبان پڑھانے کا معقول انتظام کرنا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے ــــ وہ مقام جو کہ خود برٹش گورمنٹ صحیح سمجھتی تھی ــــ زبان پڑھانے کا کورس تیّار کرنا اور اردو ادب کی اچھی چیزوں کا ترجمہ کرنا وہ کام تھے جنھیں ہمیں مقدم سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے یہی کام سنبھالنا چاہا، اور سمجھا کہ موجودہ حالات میں ''خدمتِ خلق'' کی ایک صورت یہ ہے۔

لیکن مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ SOAS کے اربابِ حلّ و عقد کے خیالات کچھ اور ہی تھے۔ ان کو ان مقاصد سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ SOAS کو ایک بڑی رقم ملی تھی جس کی بدولت اس کو اپنے لکچررز کی تعداد میں خاصا اضافہ کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ اور بس، ختم معاملہ۔ رہے یہ نئے لکچررز، ان کو اس قسم کی خدمتِ خلق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کو دلچسپی خدمتِ خلق سے زیادہ خدمتِ خود سے تھی۔ اور SOAS کے حکّام؟ وہ اس ''خدمتِ خود'' کے رویہ کو نہ صرف قدرتی اور جائز سمجھتے تھے، ان کی نظر میں یہ خیال مستحسن بھی تھا۔ مجھ سے ان کو یہ توقع تھی کہ میں بھی وہ کام مقدم رکھوں گا جن سے جلد از جلد میری ترقی ہوسکے۔

۱۹۵۰ میں جب ایک سال کی تعلیمی رخصت (study leave) سے لوٹ کے SOAS پہنچا اور A.H. Harley سے (جن کا میں جانشین ہونے والا تھا) اپنے کام کے پروگرام کے بارے میں مشورہ کیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ ''آپ اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے کونسا موضوع انتخاب کریں گے؟'' مجھے ان کے اس سوال پر حیرت ہوئی۔ میری دلچسپی اردو ادب سے تھی۔ چار سال پہلے میں نے اردو ادب کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی تھی اور میں (بالکل بجا طور پر) سمجھتا تھا کہ میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ میں اردو ادب پر ''تحقیق'' کروں۔ اس لیے میں نے کہا کہ ''میرا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرنے کا ارادہ ہے نہیں۔'' اگر مجھے ان کے سوال سے حیرت ہوئی تھی تو ان کو میرے جواب سے اس سے کہیں زیادہ حیرت ہوئی، اور صاف

ظاہر تھا کہ ان کو کافی بڑا صدمہ ہوا۔ ان کو میرے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرنے کے انکار سے اتنی پریشانی ہوئی کہ مجھے فوراً صدرِ شعبہ کے پاس لے گئے تاکہ وہ مجھے سمجھائیں اور راہِ راست پر لائیں۔ جب وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکے تو وہ فوراً، Harley سمیت، مجھے ڈائریکٹر کے پاس لے گئے۔ لیکن وہ بھی مجھے سمجھا نہیں سکے۔ یہاں اس واقعے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (آپ کو زیادہ تفصیل چاہئے تو میرا مضمون "Urdu and I" دیکھئے۔)

خلاصہ یہ کہ وہ لوگ مجھے سمجھا تو سکتے تھے، مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور فیصلہ کیا کہ ان خطوط پر کام کرنا شروع کروں گا جو میں صحیح سمجھتا تھا۔ اور آج بھی انھیں خطوط پر کام کر رہا ہوں۔

میرے اس فیصلے کے کافی دوررس نتیجے نکلے۔ ایک نتیجہ یہ تھا کہ میرا اردو ادب کا مطالعہ کافی محدود رہا۔ اردو زبان پڑھانے کا معقول کورس تیار کرنے میں کافی سال لگے، اور اس دوران ادب کا وسیع مطالعہ کرنا ناممکن تھا۔ زیادہ تر میں وہ کتابیں پڑھتا رہا جن کو مجھے طالب علمی کے زمانے میں پڑھنا پڑا تھا اور اب مجھے دوسروں کو پڑھانا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں ان کتابوں سے بہت اچھی طرح واقف ہو گیا اور اردو شاعری اور نثر کے شاہکاروں کو بڑے غور سے پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ نصاب کا دائرہ بھی کافی وسیع تھا۔ شاعری میں میر، غالب، مومن، ذوق، اور دوسرے شعرا کی غزلوں کا انتخاب تھا۔ پھر مثنویِ میر حسن (''سحر البیان'')، میر انیس کا مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے،'' حالی کا مسدّس اور اکبر الہ آبادی کے کلام کا انتخاب۔ نثر میں میر امّن کی ''باغ و بہار،'' غالب کے خطوط کا انتخاب، محمد حسین آزاد کے ''آبِ حیات'' کا ایک حصّہ، حالی کا ''مقدّمۂ شعر و شاعری،'' اور نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' یہ اس وقت کا نصاب تھا جب میں نے اردو میں بی۔ اے۔ آنرز کا کورس شروع کیا تھا (اور یہ فہرست مکمّل نہیں ہے)۔ آگے چل کر میں نے نصاب کا دائرہ اور بھی وسیع کردیا۔ مثال کے طور پر شاعری میں میر کی مثنوی ''معاملاتِ عشق،'' سودا کا ایک قصیدہ اور ایک مخمّس، شوق کی مثنوی ''زہرِ عشق،'' نظیر اکبرآبادی کی کچھ نظمیں اور اقبال اور فیض کی کئی مشہور نظمیں (اقبال کی زیادہ، فیض کی کم) ــ ان سب کا اضافہ کیا۔ نثر میں رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' اور پریم چند اور ترقّی پسندوں کے کچھ افسانے نصاب میں شامل

کیے اور فرحت اللّٰہ بیگ کی ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی۔'' (یہ بھی مکمل فہرست نہیں ہے۔) لیکن اس سے بہت زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں مِل سکا۔ ہاں، جب مجھے سال بھر کی تعلیمی رخصت (study leave) ملتی تھی تو زیادہ پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ۱۹۵۰-۱۹٤۹ میں میں نے خلیل الرحمن اعظمی سے پریم چند کا ''گئودان'' پڑھا اور اپنے مارکسسٹ ساتھی ممتاز حسین کے بعض تنقیدی مضامین جن کے موضوعات تو ٹھوس تھے لیکن جن کی اردو حیرت انگیز حد تک پیچیدہ اور اُکھڑی ہوئی تھی! ۱۹۵۸ میں میں نے بیگم صالحہ عابد حسین سے میر انیس کے مراثی کا وہ انتخاب پڑھا جو ''رزم نامۂ انیس'' کے عنوان سے مسعود حسن رضوی نے مرتّب کیا تھا، اور خورشید الاسلام کی بیگم مسعودہ سے غالب کے بہت سے خطوط (یعنی محی الدین قادری زور کا انتخاب ''روحِ غالب'') اور نذیر احمد کا ناول ''ابن الوقت'' پڑھا۔ پھر وقتاً فوقتاً چونکہ مجھے نذیر احمد سے خاص دلچسپی تھی میں نے ''مرآت العروس،'' ''بنات النعش،'' '' رویائے صادقہ،'' ''فسانۂ مبتلا ،'' اور ''موعظۂ حسنہ'' کے کافی حصّے پڑھے، لیکن اس سے بہت زیادہ پڑھنے کا موقع کم ہی مل سکا۔ البتّہ یہ صحیح ہے کہ میں نے ایسی بعض چیزیں پڑھیں جو میرے طالب علم ابتدائی کورس ختم کرنے کے بعد آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ ابتدائی کورس کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے عام الفاظ کے ذخیرے میں جلد از جلد اضافہ کریں۔ میں ایسی تحریروں کی تلاش میں تھا جو بالغوں کی دلچسپی کی ہوں لیکن جن کی اردو مشکل نہ ہو۔ بعضوں کو یہ پڑھ کے تعجّب ہوگا کہ ایسی تحریریں مجھے سب سے زیادہ خواجہ حسن نظامی کی ان کتابوں میں ملیں جو انھوں نے اپنی بیوی کے لیے لکھی تھیں! موضوعات دلچسپ، زبان نہایت سلیس، اور خالص دہلوی محاورے۔ ان میں بعض ایسے موضوعات تھے جن کے ذریعے سے انگریز طالب علموں کو یہ دیکھنے کا موقع ملتا تھا کہ انگریز اور ان کا طرزِ زندگی دوسروں کی نظر میں کیسا دِکھائی دیتا تھا۔ مثال کے طور پر انگریزوں کی شادیاں، اور انگریزوں کے بادشاہ کے اختیارات اور مجبوریاں۔ آج بھی خواجہ حسن نظامی کا مقام میری نظر میں اردو نثر نگاروں کی پہلی صف میں ہے۔

دوسری طرف انگریزوں کو اردو ادب سے روشناس کرنے کا کام میرے سامنے تھا۔ اور اس کام کی وجہ سے بھی مجھے اپنے اردو ادب کے مطالعے کو محدود رکھنا پڑا۔ بہت عرصے تک ضروری تھا کہ میں صرف وہ چیزیں پڑھوں جو اس کام سے متعلق تھیں۔ ۱۹٦۹ سے

کچھ پہلے میں نے خورشید الاسلام کے تعاون سے *Three Mughal Poets* اور *Ghalib, Life and Letters* لکھیں۔ *Three Mughal Poets* میں میر، سودا اور میر حسن کا ذکر ہے، لیکن یہاں بھی میرا مطالعہ خورشید صاحب کے انتخاب تک محدود تھا۔ انھوں نے میر کے پورے کلام کا مطالعہ کیا، اور کئی بار کیا، اور پھر ان مثنویوں اور غزلوں کے اشعار منتخب کیے جو ہمارے مطلب کے تھے۔

سودا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ سودا کی ہجویہ شاعری پر اکتفا کریں گے۔ خورشید صاحب نے سب پڑھی اور انتخاب کیا۔ میں نے صرف وہ انتخاب پڑھا۔ غالب کی جب باری آئی تو تقسیمِ کار اس سے مختلف تھی۔ غلام رسول مہر کے ''خطوطِ غالب'' اور آفاق حسین آفاق کا مرتّب کیا ہوا مجموعہ ''نادراتِ غالب'' میں نے شروع سے آخر تک پڑھے اور خود انتخاب کیا۔ اسی طرح حالی کی ''یادگارِ غالب'' اور شیخ محمد اکرام کی ''حیاتِ غالب'' میں نے پڑھیں اور انتخاب کیا۔ خورشید صاحب کے حصّے میں ''مکاتیبِ غالب،'' فارسی خطوط اور ''دستنبو'' آئے۔ کافی عرصے کے بعد ہم نے اکبر الہ آبادی والا مضمون لکھا تو ہم نے کام کا وہی طریقہ اختیار کیا جو میر کے سلسلے میں کیا تھا، اور غالب کی شاعری کا انتخاب اور ترجمہ بھی اسی طرح کیا۔ اس بیان سے آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے کتنا پڑھا اور (اس سے زیادہ) کتنا نہیں پڑھا۔

کاش میں اس سے زیادہ پڑھ سکتا، لیکن دوسرے کاموں میں برابر مصروف رہنے کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اس لیے جب لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں یا لکھتے ہیں کہ میں نے ''اردو کے تمام ادب کو گہرائی سے پڑھا'' (یہ الفاظ میں نے بھوپال کے ایک اخبار ''ندیم'' مورخہ ۸ مارچ ۱۹۹۸ سے نقل کیے ہیں)، تو مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ مجھے بننے سے سخت نفرت ہے۔ من آنم کہ من دانم اور میں چاہتا ہوں کہ میری تعریف میں (جس سے ظاہر ہے مجھے خوشی ہوتی ہے!) صرف وہ باتیں لکھی جائیں جو بالکل صحیح ہوں۔

اسی طرح یہ بات مجھے پسند نہیں کہ لوگ خواہ مخواہ مجھے ''ڈاکٹر'' یا ''پروفیسر'' بنائیں۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہیں کی، اور کیوں نہیں کی۔ رہا پروفیسر کا خطاب، جو کام میں نے شروع ہی سے سنبھالنے کا فیصلہ کیا وہ (جیسے مجھے معلوم تھا کہ ہوگا) ایسا تھا کہ اس کے ساتھ میں وہ کام نہیں کرسکتا تھا جن

کی بنا پر آپ پروفیسرشپ کے عہدے پر پہنچ سکتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ہندوپاک میں ــ اور غالباً امیریکا میں ــ ہر وہ شخص پروفیسر کہلاتا ہے جو کسی کالج میں پڑھاتا ہے، اور میں لوگوں کو مجھے پروفیسر کہنے سے منع کرنے کی کوشش کبھی کی چھوڑ چکا ہوں۔)

[مسلسل]